علی گڑھ ڈائسپورہ - ۱۶

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے صد سالہ جشن کے فِنالے (دسمبر ۲۰۲۱) کی تقریب سے شروعات

آسمانِ علی گڑھ کا ایک ٹوٹا ہوا تارہ: رضا پوسٹ گریجویٹ کالج میں شعبۂ اردو کا چیئر مین

آفتاب شمسی مرحوم

امن کے ہم متوالے! سب ایک ہیں! ایک ہیں! ایک ہیں!

آفتاب شمسی، شہر یار کے دوست بھی تھے، کلاس فیلو بھی، ان کی تعریف میں کہا کرتے تھے کہ آفتاب علی گڑھ میں رہ جاتے تو ہمیں سب کو پیچھے چھوڑ جاتے، آفتاب شمسی اور ان کی نسل کے شاعر دماغ سے زیادہ دل کی شاعری کیا کرتے تھے۔ اور سب دل والے ایک ہی گیت گا رہے تھے کہ امن کے لئے جینا سیکھو اور امن کے لئے مرنا۔

کیا زبردست شاعر تھے: ایک کھیپ کی کھیپ، ایسے بلند و بالا قد کے، کہ ان کی نظیر نہ پہلے کبھی ملی نہ آگے کبھی۔ یہ سب کے سب چالیس عیسوی کے بعد کی جنگ زدہ دنیا کو امن کا پیغام دینے کے لئے نکل پڑے تھے، سر دھڑ کی بازی لگا کے! فیض کہہ رہے تھے: ''بول کہ لب آزاد ہیں تیرے''۔ اور ساحر کہہ رہے تھے :

تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں

....

یہی فضا تھی، یہی رت، یہی زمانہ تھا
یہیں سے ہم نے محبت کی ابتدا کی تھی

....

رواں ہے چھوٹی سی کشتی ہواؤں کے رخ پر
ندی کے ساز پہ ملاح گیت گاتا ہے
تمہارا جسم ہر اک لہر کے جھکولے سے
مری کھلی ہوئی باہوں میں جھول جاتا ہے
تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں

....

میں پھول ٹانک رہا ہوں تمہارے جوڑے میں
تمہاری آنکھ مسرت سے جھکتی جاتی ہے
نہ جانے آج میں کیا بات کہنے والا ہوں
زبان خشک ہے آواز رکتی جاتی ہے
تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں

....

مرے پلنگ پہ بکھری ہوئی کتابوں کو
ادائے عجز و کرم سے اٹھا رہی ہو تم
سہاگ رات جو ڈھولک پہ گائے جاتے ہیں
دبے سُروں میں وہی گیت گا رہی ہو تم
تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں

....

بستی کی ہر اک شاداب گلی خوابوں کا جزیرہ تھی گویا
ہر موجِ نفس، ہر موجِ صبا، نغموں کا ذخیرہ تھی گویا

....

ناگاہ لہکتے کھیتوں سے ٹاپوں کی صدائیں آنے لگیں
بارود کی بوجھل بُو لے کر پچھّم سے ہوائیں آنے لگیں
تعمیر کے روشن چہرے پر تخریب کا بادل پھیل گیا
ہر گاؤں میں وحشت ناچ اٹھی، ہر شہر میں جنگل پھیل گیا

شہر یار نے یہ شعر تو نہیں لکھا تھا مگر یہ شعر پڑھتے تو اصغر گونڈوی کی جگہ شاید آفتاب کا نام لے لیتے:

صنم خانے میں کیا دیکھا کہ جا کر کھو گیا شمسی
علی گڑھ کا حرم ہوتا تو، ظالم شیخ دیں ہوتا

آفتاب شمسی، اور شہر یار اور آفتاب کے مشترکہ زمانے کو یاد کر کے آفتاب کی شاعری کا دیر تک چرچا کرتے رہے اور کہتے رہے کہ ہم لوگوں میں سب سے زیادہ ذہین، شارپ، اور اچھے شعر کہنے والا تھا، علی گڑھ نے اسے کھو کر اپنا بھی نقصان کیا اس کا بھی۔ اور پیلی بھیت، علی گڑھ، رامپور رضا پوسٹ گریجویٹ کالج! اور پھر! علی گڑھ کو واپسی کبھی نہ ہوئی۔

....

خاموش زمیں کے سینے میں خیموں کی طنابیں گڑنے لگیں/ مکھن سی ملائم راہوں پر بوٹوں کی خراشیں پڑنے لگیں/ فوجوں کے بھیانک بینڈ تلے چرخوں کی صدائیں ڈوب گئیں/ جیپوں کی سلگتی دھول تلے پھولوں کی قبائیں ڈوب گئیں/ انسان کی قیمت گرنے لگی، اجناس کے بھاؤ چڑھنے لگے/ چوپال کی رونق گھٹنے لگی، بھرتی کے دفاتر بڑھنے لگے/ بستی کے سجیلے شوخ جواں، بن بن کے سپاہی جانے لگے/ جس راہ سے کم ہی لوٹ سکے اس راہ پہ راہی جانے لگے/ ان جانے والے دستوں میں غیرت بھی گئی، برنائی بھی/ ماؤں کے جواں بیٹے بھی گئے، بہنوں کے چہیتے بھائی بھی/ بستی پہ اداسی چھانے لگی، میلوں کی بہاریں ختم ہوئی/ آموں کی لچکتی شاخوں سے جھولوں کی قطاریں ختم ہوئیں/ دھول اڑنے لگی بازاروں میں، بھوک اگنے لگی کھلیانوں میں/ ہر چیز دکانوں سے اٹھ کر، روپوش ہوئی تہ خانوں میں/ بد حال گھروں کی بدحالی، بڑھتے بڑھتے جنجال بنی/ مہنگائی بڑھ کر کال بنی، ساری بستی کنگال بنی/ چرواہیاں رستہ بھول گئیں، پنہاریاں پنگھٹ چھوڑ گئیں/ کتنی ہی کنواری ابلائیں، ماں باپ کی چوکھٹ چھوڑ گئیں/ افلاس زدہ دہقانوں کے ہل بیل بکے، کھلیاں بکے/ جینے کی تمنا کے ہاتھوں، جینے ہی کے سب سامان بکے/ ....../ تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں

....

تمہارے گھر میں قیامت کا شور برپا ہے/ محاذِ جنگ سے ہرکارہ تار لایا ہے/ کہ جس کا ذکر تمہیں زندگی سے پیارا تھا/ وہ بھائی ''نرغۂ دشمن'' میں کام آیا ہے/ تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں

●

اب ساحر کی پرچھائیاں کے بعد آفتاب شمسی جنگ اور نفرت کی خوں ریزی سے لڑنے کے لئے نکل آتے ہیں، جس کی علامت ہوتی ہے ایک سپاہی کی وردی جس کی جیب سے ڈائری کا ایک ورق نکلتا ہے۔ ساحر ایک سین دکھا چکے، اب دوسرا سین شروع ہوتا ہے۔ اور قلم سے کاری زخم لگانے کی باری اب ساحر کے بعد آفتاب کے ہاتھ میں ہے، ایک سپاہی کی وردی کی جیب سے ایک پرزہ نکلتا ہے جس پر لکھا ہے:

ایک سپاہی کی وردی سے
بچوں کی فوٹو کے علاوہ
چھوٹی سی اک ڈائری نکلی
جس کے پہلے ہی صفحے پر
موٹے لفظوں میں لکّھا تھا
''مُنّی کی گڑیا لینی ہے
راجو کی اِسٹک اور گیند
پاروتی کی ریشمی ساری
ماتا جی کی اونی شال''

●

اب ساحر پھر در آتے ہیں:

تمہارے گھر میں قیامت کا شور برپا ہے/محاذِ جنگ سے ہرکارہ تار لایا ہے/کہ جس کا ذکر تمہیں زندگی سے پیارا تھا/وہ بھائی ''نرغۂ دشمن'' میں کام آیا ہے/تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں/......

....

سورج کے لہو میں لتھڑی ہوئی وہ شام ہے اب تک یاد مجھے /......./اس شام مجھے معلوم ہوا ، کھیتوں کی طرح اس دنیا میں/سہمی ہوئی دوشیزاؤں کی مسکان بھی بیچی جاتی ہے/اس شام مجھے معلوم ہوا، اس کارگہِ زرداری میں/ دو بھولی بھالی روحوں کی پہچان بھی بیچی جاتی ہے/اس شام مجھے معلوم ہوا، جب باپ کی کھیتی چھِن جائے/ممتا کے سنہرے خوابوں کی انمول نشانی بکتی ہے/اس شام مجھے معلوم ہوا، جب بھائی جنگ میں کام آئیں/سرمائے کے قحبہ خانے میں بہنوں کی جوانی بکتی ہے/ سورج کے لہو میں لتھڑی ہوئی وہ شام ہے اب تک یاد مجھے /......./مجبور ہوں میں، مجبور ہو تم، مجبور یہ دنیا ساری ہے/تن کا دکھ من پر بھاری ہے/**اس دور میں جینے کی قیمت، یا دارورسن یا خواری ہے**/....... ......

جینے کو جئے جاتے ہین مگر، سانسوں میں چتائیں جلتی ہیں/خاموش وفائیں جلتی ہیں/ سنگین حقائق زاروں میں، خوابوں کی ردائیں جلتی ہیں/ ....../ پھر موت کی آندھی اٹھی ہے، پھر جنگ کے بادل چھائے ہیں/.....................

بہت دنوں سے ہے یہ مشغلہ سیاست کا/کہ جب جوان ہوں بچے تو قتل ہو جائیں/ بہت دنوں سے ہے یہ خبط حکمرانوں کو/کہ دور دور کے ملکوں میں قحط بو جائیں/.....................

چلو کہ چل کے سیاسی مقامرون سے کہیں/کہ ہم کو جنگ وجدل کے چلن سے نفرت ہے/ جسے لہو کے سوا کوئی رنگ راس نہ آئے /ہمیں حیات کے اس پیرہن سے نفرت ہے/ کہو کہ اب کوئی قاتل اگر ادھر آیا/تو ہر قدم پہ زمیں تنگ ہوتی جائے گی/ ہر ایک موجِ ہوا رخ بدل کے جھپٹے گی/ ہر ایک شاخ رگِ سنگ ہوتی جائے گی/ اٹھو کہ آج ہر اک جنگ جو سے یہ کہہ دیں/کہ ہم کو کام کی خاطر کلوں کی حاجت ہے/ہمیں کسی کی زمیں چھیننے کا شوق نہیں/ہمیں تو اپنی زمیں پر ہلوں کی حاجت ہے/ کہو کہ اب کوئی تاجر ادھر کا رخ نہ کرے/ اب اس جگہ کوئی کنواری نہ بیچی جائے گی/ یہ کھیت جاگ پڑے ، اٹھ کھڑی ہوئیں فصلیں/ اب اس جگہ کوئی کیاری نہ بیچی جائے گی/ یہ سرزمین ہے گوتم کی اور نانک کی/ اس ارضِ پاک پہ وحشی نہ چل سکیں گے کبھی/ ہمارے خون پہ لشکر نہ پل سکیں گے کبھی/ کہو کہ آج بھی ہم سب اگر خموش رہے/تو اس دمکتے ہوئے خاکدان کی خیر نہیں/ جنوں کی ڈھالی ہوئی ایٹمی بلاؤں سے/ زمیں کی خیر نہیں، آسماں کی خیر نہیں/ ....../تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں۔

●

آفتاب شمسی ہائی اسکول کے طالب علم رہے ہوں گے جب ساحر (لدھیانوی) نے یہ سب کچھ لکھا تھا۔

آفتاب شمسی نے پرچھائیاں ضرور پڑھی ہوگی مگر اسکا عکس دوسرے رنگ میں جھلکا جب آفتاب نے ساحر کے بیس سال بعد اپنا پہلا مجموعہ لمحوں کا حصار پڑھوایا اور ساحر کے انسپریشن (= ساحر کے حصار میں رہ کر) ساحر سے آگے بڑھ کر، لمحوں کے حصار میں شامل یہ تین نظمیں لکھی تھیں: دل کے خون میں انگلیاں ڈبو کر بس ایسے ہی لکھا جاتا ہے:

ایک سپاہی کی وردی سے/ بچوں کی فوٹو کے علاوہ/ چھوٹی سی اک ڈائری نکلی/ جس کے پہلے ہی صفحے پر/ موٹے لفظوں میں لکھا تھا/ ''منّی کی گڑیا لینی ہے/ راجو کی اسٹک اور گیند/ پاروتی کی ریشمی ساڑی/ ماتا جی کی اونی شال''

●

اُجلے صاف رسوئی گھر میں/ ماں کے آنسو گرم توے پر /گرِ گرِ کر جلتے جاتے ہیں/ باپ اپنے میلے دامن سے/ بھیگی آنکھیں پونچھ رہا ہے/ اک بچی ماں کے گھونگھٹ میں/ کاجل بہتا دیکھ رہی ہے/فوجی وردی پہنے کوئی/ آنگن میں تیار کھڑا ہے /تانگے کے گھنگھرو سن کر سب/ دروازے پر جمع ہوئے ہیں/ رو کر بیٹھ گئے سب لیکن/کھیتوں کے اس پار ابھی تک/ تانگے کے گھنگھرو بجتے ہیں۔

●

وہی لنگڑا ضعیف العمر فوجی /کہ جس کا اک جوان العمر بیٹا/ گذشتہ جنگ میں مارا گیا ہے/سڑک کے موڑ پر پیپل کے نیچے/ بٹھائے گود میں پوتے کو اپنے/گزرتی لاریوں کو تک رہا ہے /کہ جن میں وردیاں پہنے سپاہی/ دماغ اور دل سے لڑ کر اک لڑائی/ محاذِ جنگ پر یوں جا رہے ہیں/ کہ جیسے کوئی لڑکی کمسنی میں /مہاجن کی رقم دینے کے کارن/کسی زردار بوڑھے بوالہوس کو/ زبردستی بیاہی جا رہی ہو!

●

امن اور شانتی اور سکون اور محبت ۔ اردو کے بزرگ ترین شاعر کا کہنا ہے کہ (معمولی ترمیم کے ساتھ)

ہیں یہ وہ لفظ جو شرمندۂ معنی نہ ہوئے۔

شرمندۂ معنی ہوتے ہیں بد امنی، آویزش، جنگ اور نفرت؛ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

●

آدمی تو عام حالات میں ایک دوسرے سے شرافت کا، خلوص کا بیوہار کرنا چاہتا ہے، ہر سینے میں پیار کی پھواریں، پتھر والے سینوں میں سے بھی پھوٹی پڑتی ہیں، جب سینہ دار کو یاد آتا ہے کہ وہ تو انسان ہے۔ انسان ہی پیدا ہوا تھا۔ اور اسّی نوے سال گزار کے اسی مٹی میں رل مل جانا ہے۔ پھر ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ایران عراق برسوں ایک دوسرے کا خون بہاتے رہے۔ بچے جوان ہوتے رہے اور ایک دوسرے کو مرتے مارتے رہے۔ میانمار میں امن چاہنے والوں کا قتل ہوتا رہا۔ لنکا میں، ٹامل غیر ٹامل ایک دوسرے کے خون سے اپنی پیاس بجھاتے رہے۔ ہندستان اور پاکستان ماں جائے ایک دوسرے کے بھائی: اور خبریں آتی ہیں کہ سرحد پر اِدھر والوں (فوجی) نے اُدھر کو یا اُدھر والوں نے اِدھر والوں کو مار دیا۔ شمالی مشرقی اور شمالی مغربی علاقوں میں لوگ امن کے لئے ترستے رہتے ہیں۔

یہ جنگ وجدل اور خون خرابہ جو ساحر نے اپنی جوانی میں انتالیس- پینتالیس (1939-45) کی جنگ میں دیکھا تھا جب ناگاساکی اور ہیروشیما خاک وخون میں لوٹے تھے، پھر جنگ کے بعد سینتالیس آیا

ع وہ تیغ اپنے ہی دل میں نیام ہوتی رہی

ع ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا احساب

یعنی لاکھوں ماں جائے ایک دوسرے کو مارتے رہے۔ پھر سینتالیس کو پچیس برس نہ گزرے تھے کہ بنگلہ دیشی خون اور پاکستانی خون، ایک دوسرے کو کاٹ کے خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ پھر اکہتر کی خون ریزی کو چودہ پندرہ سال مشکل سے گزرے تھے کہ سکھ اپنے ہی وطن میں بے وطن ہو گئے۔ اندرا گاندھی کا قتل تو ایک بہانہ تھا نفرت کا لاوا تو ذرا سے اشارے پر پھوٹ پڑتا ہے، ہزاروں لوگ مارے گئے۔ اور پھر اِدھر دنگا، اُدھر فساد، اِدھر جنگ، اُدھر جنگ۔ یہ آدمی کو کیا ہو گیا ہے۔ اور ہم، ہمارے بچے، سپاہی بن کر، ایک دوسرے پر اس طرح گولیاں برساتے ہیں، اور توپوں کے دہانے کھول دیتے ہیں، اور دونوں طرف ایک ہی ماں کے بچے، جو ان کی سگی ماں تھی اور ہے، مارا ماری کرتے رہتے ہیں، سپاہی مرتے رہتے ہیں، پھر دوسرے سپاہی ان کی جگہ بھرتی ہو جاتے ہیں، پھر مرنے کے لئے اور مارنے کے لئے۔ ساحر کہتا ہے، اُس سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں جس راہ سے کم ہی خوش قسمت لوٹ کے آتے ہیں۔ وہ خوش قسمتی کی راہ تکنے والا، جس کی جیب سے ایک ڈائری نکلی تھی، اگلے دن اپنوں سے ملنے کے لئے روانہ ہونے والا تھا۔ بوڑھی ماں اور بوڑھا باپ اور اس دن تک اپنے کو سہاگن سمجھنے والی پتنی اور ان کی معصوم بچی، دروازے کی راہ تک رہے تھے کہ اس سپاہی کی جگہ رجمینٹ کے افسر کا بھیجا ہوا ایک تار پہنچا، تار کے ساتھ سپاہی کی ڈائری کا آخری ورق، جس پہ سپاہی کی آخری یادداشت لکھی ہوئی تھی:

ایک سپاہی کی وردی سے
بچوں کی فوٹو کے علاوہ
چھوٹی سی اک ڈائری نکلی
جس کے پہلے ہی صفحے پر
موٹے لفظوں میں لکّھا تھا
''مُنّی کی گڑیا لینی ہے
راجو کی اِسٹک اور گیند
پاروتی کی ریشمی ساری
ماتا جی کی اونی شال''

یہ سب دیوانے جو شاعر کہلاتے ہیں، ساحر بھی اور آفتاب بھی جن میں شامل ہیں، سب مل کر ایک پیغام دے رہے ہیں:

امن کے ہم متوالے!

ہم ایک ہیں! ہم ایک ہیں! ہم ایک ہیں!

☆☆☆

سرسید کا احتجاجی کردار۔۲

سرسید کی کچھ بھولی بسری تحریروں کی پیشکش: انتخاب از پروفیسر سید ابوالخیر کشفی مرحوم

شافع قدوائی کے ردیف قافیے میں ''انگریزی راج کا سب سے بڑا باغی: سرسید'' کے عنوان سے پہلی قسط ڈائسپورہ نمبر۔۱۵، میں آئی تھی، اب یہ دوسری قسط شافع قدوائی کا عنوان مستعار لے کر اس ڈائسپورہ۔۱۶، میں ''ابوالخیر کشفی انتخاب'' میں دی جارہی ہے۔ساتھ ہی شافع قدوائی کے بڑے خوبصورت مضمون سے ضروری اقتباسات بھی شامل کیے جارہے ہیں۔پڑھیے اور فخر کیجئے کہ کیا آپ ہندستان کے ایک اتنے بڑے آدمی کے بنائے ہوئے علی گڑھ کے فرزندوں میں اپنے آپ کو شمار کرسکتے ہیں۔

غلامی گناہ ہے

یہ سمجھنا کہ اگر غلام آرام وآسائش سے رکھے جاویں اور رحم ومحبت سے پرورش کئے جائیں گے تو کوئی برائی نہیں ہے، محض غلطی اور سرتا سر دھوکا ہے۔غلامی فی نفسہٖ ایک قدرتی گناہ ہے اوران کو بدسلوکی سے رکھنا دوسرا گناہ ہے۔پس کوئی چیز قدرتی گناہ سے زیادہ خوفناک نہیں ہے۔

غلامی تمام اخلاق انسانی کو خراب کرنے والی ہے۔غلاموں کے حالات اور ان کی عقل اور عادات انسانی حالت سے تنزل کرکے حیوانی حالت میں آجاتے ہیں، اور جولوگ غلام بناتے ہیں وہ جبراً اور ناانصافی سے انسان کو جو اشرف المخلوقات ہے تنزل کی حالت میں ڈالتے ہیں۔غلامی کی حالت میں انسان کے تمام قدرتی قویٰ جن کو خدانے وسیلہ ترقی بنایا ہے معطل وبے کار ہوجاتے ہیں اوران کی حالت ہر طرح پر ان کی ترقی کی، جن کی ترقی کرنا قدرت کے قانون بنانے والے قادر مطلق کی مرضی ہے، مانع ہوتی ہے۔

سچا ریڈیکل

''......میں مسلمان ہوں' ہندستان کا باشندہ ہوں اور عرب کی نسل سے ہوں۔انہیں دو باتوں سے کہ میں عرب کی نسل سے ہوں اور مسلمان ہوں' آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مذہب اور خون دونوں کے لحاظ سے میں سچا ریڈیکل ہوں۔اہل عرب اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ بجائے اس کے کہ وہ خود اپنے اوپر حکومت کریں' کوئی اور ان پر حکومت کرے۔اس وقت تک اہل عرب آزاد ہیں اپنے مشائخ کے جھنڈوں کے نیچے رہتے ہیں۔وہ سلطان ٹرکی کو سلطان نہیں کہتے بلکہ اپنے زبان وعمل سے ویران اور پتھریلے جزیرہ نما کا خادم سمجھتے ہیں۔وہ اپنی آزادی کو تمام دنیا کی نعمتوں سے بہتر جانتے ہیں' اونٹ چراتے ہیں' جَو پر زندگی بسر کرتے ہیں' اونٹنیوں کا دودھ پیتے ہیں' اور اپنی آزادی میں خوش رہتے ہیں۔

ابھی تک میری رگوں میں عرب کا خون گردش کرتا ہے اور پھر میرا مذہب یعنی اسلام جس پر مجھے پورا اور پکا یقین ہے وہ بھی ریڈیکل اصولوں کو سکھلاتا ہے اور شخصی گورنمنٹ سے موافق نہیں' اور نہ لمیٹڈ مانرکی کو مانتا ہے بلکہ موروثی حکومت ناپسند کرتا ہے۔

ایک پریزیڈنٹ جس کو لوگ منتخب کریں، اس کو اسلام پسند کرتا ہے اور اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ دولت ایک جگہ اکٹھی رہے۔ اسی اصول کے موافق اسلام کے بانی نے یہ قاعدہ بنایا کہ بعد فوت ہوجانے کسی شخص کے اس کی جائیداد بہت سے آدمیوں میں تقسیم ہوجاوے کیونکہ کتنی ہی زیادہ جائیداد کیوں نہ کہ وہ بعد دو نسلوں کے یقیناً بہت سے حصوں میں تقسیم ہوجاوے گی۔پس میں دونوں طرح' کیا بالحاظ مذہب اور کیا بلحاظِ خون کے ریڈیکل ہوں۔

لیکن ہمارا مذہب' جس نے یہ خیالات آزادی کے میرے دل میں پیدا کئے' اس نے اور باتیں بھی سکھائی ہیں۔ ایک یہ کہ اگر خدا کے حکم سے ہم کسی ایسی قوم سے مفتوح ہوجائیں جو کہ ہم کو مذہبی آزادی دیتی ہے' انصاف سے ہم پر حکمرانی کرتی ہے، تو اس حالت میں ہم کو اس کا تابعدار اور خیر خواہ رہنا چاہئے۔دوسرے یہ کہ وہ ریڈیکل اصول' جو ہم نے اپنے باپ دادا اور اپنے مذہب سے سیکھے ہیں' ان پر ہم کو صرف اسی حالت میں عمل کرنا چاہئے جب کہ زمانے کی حالت ان کے عمل میں لانے کے موافق ہو' نہ کہ اس حالت میں جب کہ زمانے کے حالات ان کے موافق نہ ہوں۔مثلاً جبکہ ان کے اختیار کرنے سے ملک کے اندرونی امن یا گورنمنٹ کے قائم رہنے میں فرق آوے یا اس کو کمزور اور ضعیف کردے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ ہر ایک قوم اور ہر ایک خیال کے لوگ خواہ وہ کنسرویٹو ہوں' خواہ لبرل اور خواہ ریڈیکل' سب اسی اصول کو قبول کریں گے......''۔ (ایک معزز انگریز کے نام خط : **''حیات جاوید''** سے نقل کیا گیا)

*

نماز نہ پڑھنے کا صرف ایک گناہ ہے جس کے بخشے جانے کی توقع ہے، مگر کسی شخص (انگریز ڈپٹی کمشنر) کے منع کرنے سے نہ پڑھنا میری سمجھ میں کفر ہے

(حیدرآباد دکن میں اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز ہونے سے پہلے مولوی مشتاق حسین ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں معمولی اہل کار تھے. انگریز ڈپٹی کمشنر نے عدالت کے اوقات میں جماعت کے ساتھ نماز ظہر کی ادائیگی سے انہیں منع کیا. انھوں نے سر سید کو سارا معاملہ لکھ بھیجا. سر سید کا جواب ملاحظہ ہو.)

بھائی مشتاق حسین! کل میں سارا دن متردد رہا' کیونکہ تمہارا کوئی خط نہیں آیا تھا۔آج خط آیا اور حال معلوم ہوا۔گو میں کسی وقت کی نماز پڑھتا ہوں اور کسی وقت کی نہیں پڑھتا اور وقت بے وقت کا بھی خیال نہیں کرتا' دو دو اکٹھی بھی ملا کے پڑھ لیتا ہوں۔ریل میں لمبا سفر ہو تو مجھ سے نماز ادا نہیں ہوتی۔یہ سب باتیں مجھ میں ہیں اور نالائقی اور شامت اعمال سے ایسی سستی نماز میں ہے۔مگر تم نے اس معاملے میں جو پیش آیا نہایت لچرپنا کیا۔نماز جو خدا کا فرض ہے اس کو ہم اپنی شامت اعمال سے جس خرابی سے ہو ادا کریں یا قضا کریں، لیکن کوئی شخص اگر کہے کہ ''تم نماز نہ پڑھو' اس کا صبر ایک لمحہ بھی نہیں ہوسکتا۔یہ بات سنی بھی نہیں جاسکتی۔میری سمجھ میں نماز نہ پڑھنے کا صرف گناہ ہے جس کے بخشے جانے کی توقع ہے۔اور کسی شخص کے منع کرنے سے نہ پڑھنا یا سستی میں ڈالنا میری سمجھ میں کفر ہے جو کبھی بخشا نہ جائے۔تم کو پہلے ہی اپنی طرف سے ایسا طریقہ اختیار کرنا تھا جو کبھی اس قسم کی بحث نہ آتی۔اور جب ایسا طریقہ نہیں کیا تھا تو پھر لجلجانا اور گڑگڑانا کیسا۔''حضور رخصت ہی دیں۔'' ''تنخواہ کاٹ لیں'' کہنا واہیات تھا۔تڑاق سے استعفاء دے دینا تھا اور صاف کہہ دینا تھا کہ ''میں اپنے خدائے عظیم الشان' قادر مطلق کے حکم کی اطاعت کروں گا نہ آپ کی۔'' کیا ہوتا' نوکری نہ میسر ہوتی' فاقے مرجاتے۔نہایت اچھا ہوتا۔

(بنام نواب وقار الملک، مولوی مشتاق حسین)

☆☆☆

سرسید کا احتجاجی کردار

پیشکش: پروفیسر شافع قدوائی

(۱۸۵۷ء کے بعد) وہابیوں کی گرفتاری اور ان کے خلاف تعزیری کارروائی کی مزاحمت کا اولین سراغ سرسید کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ملتا ہے۔ گزٹ نے وہابیوں کے خلاف حکومت کی کارروائی کو بعض مفسد ہندوستانیوں کی سازش قرار دیا اور مخبروں پر انحصار کرنے کے لیے حکومت کو ہدفِ ملامت بناتے ہوئے اپنے ایک اداریہ میں لکھا:

''گورنمنٹ سے اس بات کی درخواست ہے کہ جو کچھ بھی اس معاملہ میں کرے حتی الامکان تامل اور حلم کے ساتھ کرے تاکہ اس کی تدبیر مملکت میں یہ امر خلل انداز نہ ہو۔ اور ایسے نازک معاملہ میں حد سے زیادہ تعجیل نہ فرمائے جس کے سبب سے خفیف خفیف باتوں پر لوگوں کو گرفتار کرتی ہے۔ کیا وہ اپنی پائیدار اور مستحکم حکومت میں ایسی خائف ہے کہ ذرا سے دھوکہ سے اپنے معاندین کا خوف کرنے لگتی ہے؟ پس اس لحاظ سے ہماری رائے یہی تھی اور اب بھی ہے کہ اگر سرکار کو کسی قسم کا اندیشہ مفسدوں کی طرف سے ہو تو اس اندیشے کو آدابِ سلطنت کے موافق اس خوبصورتی سے رفع فرمائے کہ مفسدوں کو اس سے خوف ہو نہ کہ سرکار کے خائف ہونے کا توہم ہو۔ اور اس کی صورت یہی ہے کہ جو لوگ دراصل مفسد ہیں ان کے حالات پر نہایت تحقیق و تامل کی نظر کر کے ان کی بیخ کنی کرے اور اس امر کو ہرگز قرینِ صواب نہ خیال فرمائے کہ جس شریف و ذی عزت کی نسبت کسی مفسد یا بدمعاش کے کہنے سے شبہ ہو جائے تو فوراً اس کو اول گرفتار کیا جائے اور جب بخوبی اس کی آبروریزی ہو جائے اور اس عرصہ میں اس کا بےقصور ہونا ثابت ہو جائے تو اس کو رہا کر دیا جائے۔ اس تدبیر سے بجز اس بات کے کہ رعایا بادل ہو اور کوئی فائدہ متصور نہیں ہے۔ بعض مفسد اپنا شعار یہی قرار دیتے ہیں کہ وہ اپنی قدیمی عداوتوں کو ایسے وقت پر نکالیں اور مخبری سے اپنا روسیاہ کر لیں، اور اس سے ان کو کچھ بحث نہیں ہوتی کہ انجام کار ہمارے لیے یا سرکار کے انتظام میں اس سے کیا خلل ہوگا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ فی زمانہ اضلاع پنجاب میں مخبری کا بازار نہایت گرم ہے اور مفسدوں اور بدمعاشوں کے ہاتھ سے شرفا کی جان عذاب میں ہے''۔

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، یکم مارچ 1871ء)

شمال مغربی صوبہ کی حکومت گزٹ کی کئی سو کاپیاں خریدتی تھی اور انہیں مختلف اسکولوں کو بھیجا جاتا تھا۔ اس مضمون کا تیز لہجہ حکومت برداشت نہیں کر سکی اور پہلی بار شمال مغربی صوبہ کے کسی اخبار کو سرکاری وارننگ جاری کی گئی۔ اس وارننگ سے گزٹ کے احتجاجی کردار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ وارننگ 20/اپریل 1875ء کو جاری کی گئی اور اس کا آفیشیل میمو نمبر 69999 تھا۔ اس وارننگ کی اصل عبارت ملاحظہ کریں:

"Undersigned is directed to invite the attention of the editor of the Aligarh Institute Gazette to the improper and injustice of the criticism hazard at page no. 181 and 182 of the issue of the 19th March 1875 and to remind him that the paper is taken by the government cannot be expected to subscribe to any paper which expresses opinion on those in the article in question".

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، 13/اپریل 1875ء)

پروفیسر شافع قدوائی کا ایک تحفہ: سرسید کا احتجاجی کردار (ماہنامہ تہذیب الاخلاق، اکتوبر 2022)

☆☆☆

لکھنؤ کے علی گڑھ اولڈ بوائز نے ۱۷/اکتوبر کی عید منائی

اس بار بہت سی جگہوں کی طرح لکھنؤ میں بھی علی گڑھ اولڈ بوائز نے سترہ اکتوبر کی عید منائی۔ مہمان خصوصی فیضان مصطفیٰ تھے، اور جنرل ضمیر الدین شاہ تھے، اور لائق احترام لکھنؤ اولڈ بوائز۔ منتظمین میں خاص اولڈ بوائے ڈاکٹر مبشر تھے، اور ڈاکٹر عظمیٰ۔

بڑا شاندار جلسہ ہوا۔ جلسہ میں بہت مزے مزے کی باتیں بھی ہوئیں، جن میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ ''معترضین یہ کہتے ہیں کہ بس سرسید ڈے ہو جاتا ہے، اور کچھ نہیں ہوتا'' جس کا جواب یہ ہے کہ وہ بھی ہو یہ بھی ہو۔ کوئی نماز پڑھنے جا رہا ہو تو اس پر یہ بھی پابندی لگانا کہ روزہ بھی رکھو۔ دراصل دونوں اپنے اپنے وقت پر ضروری ہیں۔ مگر اب جو سنانے کی خاص باتیں ہیں، وہ ہم آپ کو سنائیں:

فیضان مصطفیٰ نے کہا:

- سرسید کو تو مانتے ہو، مگر سرسید کی نہیں مانتے، جو کہتے تھے کہ ''ہم وطنوں سے کوئی شکایت ہو یا سرکار سے، دونوں صورتوں میں شکایات دور کرنے کا کوئی بھی طریقہ اپنا سکتے ہو، سوائے **violence** کے۔
- رہی یکساں سول کوڈ کی بات، تو قرآن میں اور اسلام میں اور سیرت رسول میں ہمارے لئے مکمل ہدایات موجود ہیں۔ اور ہمارے فقیہوں نے اچھی طرح غور و فکر کر کے ہمارے لئے اسلام کو اور زندگی کو آسان بنا دیا ہے۔ اور وہ یہ کہ طلاق کے پانچ طریقے ہیں، اور یہ کہ طلاق کا صرف ایک ہی طریقہ نہیں ہے، جسے لے کر مسلم دشمن، اسلام کو دنیا بھر میں بدنام کرتے رہتے ہیں؛ پانچ طریقے ہیں۔ ان میں ایک یہ بھی ہے کہ طلاق یکطرفہ کے بجائے دونوں فریق یعنی دونوں کی مرضی کو شامل ہو، جبھی طلاق فائنل ہوگی۔

فیضان مصطفیٰ نے یہ بھی کہا تھا کہ روس میں رہنے والا روسی کہلاتا ہے، جرمن، تو ہندستان میں رہنے والا دھرم اور مذہب کے لحاظ سے مسلمان ہو یا ہندو یا سکھ ہو، ہندستانی ہونے کے لحاظ سے ہندستانی کہلائے گا۔ اب اسے ہندو۔ استھانی کہیے (ہندستانی) یا ہندو کہیے۔ فیضان مصطفیٰ نے کہا کہ ہندستان کو مہان دیش بنانے کے لئے ساری سوچ نہ سہی، بڑا حصہ سرسید ہی کا فیضان ہے۔ آج بھی علی گڑھ ہندستان کو ترقی کے راستے پر چلانے کے لئے بہت کچھ روشنی دے سکتا ہے۔

☆☆☆

نارنگ پر ایک اچھا مضمون

از ف۔سین۔اعجاز

نظریہ ساز اردو نقاد و محقّق، ماہرِ لسّانیات و اسلوبیات گوپی چند نارنگ بروز بدھ 15 جون 2022 کو شارلٹ، امریکہ میں 91 سال کی عمر میں اپنے بیٹے ترون نارنگ کے گھر میں افراد خاندان کی موجودگی میں انتقال فرما گئے۔

نارنگ انوکھی صفات کا مجموعہ تھے۔ معلّمِ اردو، منفرد ادیب، سیمیناروں، کانفرنسوں اور علمی تقریبات کے بے مثال انتھک منتظم، کارواں ساز شخصیت کے مالک، اردو زبان کی بقا کے لئے ہر ممکن اقدام کرنے والے گوپی چند نارنگ کی ہمسری کا دعویٰ کوئی نہیں کرسکتا۔ اردو کو وہ تکثیری سماج کی علامت گردانتے تھے۔ تحریکِ آزادی اور اردو شاعری، اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب جیسی اپنی کتابوں میں یہ بات انہوں نے بارہا پورے پورے جواز کے ساتھ لکھی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ زبانوں پر گفتگو کرتے ہوئے جنونیت اور انتہا پسندی کو رَد کردینا چاہئے۔ ان کا لسانی نظریہ سائنسی علم اور باہمی رواداری پر مبنی تھا۔ گرچہ نارنگ اردو کو اُس کے اصل رسم الخط کے ساتھ برقرار رکھنے کے حامی تھے لیکن اردو اور ہندی کی خلقی حقیقت [یا فطرت] کو برّصغیر کے لسانی تاریخی پس منظر میں دیکھتے تھے۔ دونوں زبانوں میں انہیں گوشت اور خون کا رشتہ نظر آتا تھا۔ ان کے نزدیک ہندی کے بغیر اردو اردو نہیں تھی اور اسی طرح ہندی بھی اردو کے بِنا مکمل نہیں تھی۔ ہندی اور سنسکرت سے اردو نے بہت کچھ لیا ہے۔ گرامر میں بھی اور صوتی نظام میں بھی اردو نے ہندی اور سنسکرت کے اثرات قبول کئے ہیں۔ اردو میں فارسی اور عربی کا ہر تلفّظ ادا کیا جاسکتا ہے لیکن ٹ، ڑ، ڈ جیسے حروف کی آوازیں اردو میں سنسکرت اور ہندی سے ہی آئی ہیں۔ عربی میں پ اور گ حروف بھی نہیں ملتے۔ نارنگ ماہرِ السنہ تھے۔ زبانوں کی ایجاد اور حروف کے مخرج پر غور کرنا ان کی علمی ضرورت تھا۔ اردو اپنے اسکرپٹ میں ہند آریائی زبان ہے لیکن دراوڑی لہجوں سے بھی متاثر ہے اور ان تمام عناصر نے اردو کو اس طرح مکمل کیا ہے کہ ہندوستان کے تکثیری نظام میں اسے سب سے الگ مقام حاصل ہے۔ ہر زبان کا رسم الخط اپنی پہچان اور خوبصورتی رکھتا ہے۔ اس لئے ہر زبان کی اصلیت اور انفرادیت کو برقرار رہنا چاہئے۔

گوپی چند نارنگ 11 فروری 1931 کو بلوچستان کے ضلع دُکّی کے گاؤں لورالائی میں پیدا ہوئے جو تب موجودہ پاکستان اور افغانستان کے درمیان ایک گاؤں تھا۔ تقسیم کے بعد 1947 میں وہ سانحۂ کوئٹہ کے بعد اپنے بڑے بھائی کے ساتھ ریڈ کراس کے جہاز سے اپنی والدہ کے ساتھ دہلی منتقل ہوئے۔ ان کے والد ملازمت سے سبکدوش ہوکر 1956 میں دہلی آئے۔ گوپی چند نارنگ نے دہلی کالج سے اردو میں ایم اے کیا۔ 1958 میں وزارت تعلیم کے تحت ریسرچ فیلوشپ مکمل کرکے پی۔ ایچ۔ ڈی کی۔ سینٹ اسٹیفنس کالج سے 1957-58 میں درس و تدریس کا آغاز کیا۔ اس کے بعد دہلی یونیورسٹی میں لیکچرر اور 1961 میں ریڈر رہوئے۔ 1963 اور 1968 میں وسکونسن یونیورسٹی امریکہ میں وزِٹنگ پروفیسر ہوئے۔ اُسی دور میں مِنے سوٹا یونی ورسٹی اور اوسلو یونیورسٹی، ناروے میں بھی تعلیم دیتے رہے۔ ساتھ ہی اٹلی کی راک فیلر یونیورسٹی کے وزِٹنگ فیلو رہے۔ 1974 سے 1981 تک جامعہ ملّیہ اسلامیہ میں شعبۂ اردو میں پروفیسر رہے۔ 1981-82 میں جامعہ ملّیہ اسلامیہ کے قائم مقام وائس چانسلر تھے۔ 1986 سے 1995 تک دہلی یونیورسٹی میں پروفیسر رہے۔ 2005 سے دہلی یونیورسٹی میں اور 2013 سے جامعہ ملّیہ اسلامیہ میں پروفیسر ایمریٹس ہوئے۔

دہلی یونیورسٹی میں اردو کا شعبہ نارنگ کے مشفق استاد اور رہنما خواجہ احمد فاروقی کے زیر قیادت وزیر اعظم پنڈت نہرو کی خیر خواہی سے قائم ہوا تھا۔ اس سلسلے میں فاروقی صاحب کے ساتھ نارنگ کی جدوجہد کا احوال نارنگ کی کتاب ''خواجہ احمد فاروقی کے خطوط گوپی نارنگ کے نام'' سے معلوم ہوتا ہے۔ اپنے استاد فاروقی صاحب سے نارنگ کا ازحد جذباتی لگاؤ تھا۔

نارنگ صاحب کے نصیب میں ملک اور بیرون ملک سے کئی قابل فخر اعزازات آئے۔ 2004 میں پدم بھوشن کا اعزاز ملا۔ 1995 میں ان کی کتاب ''ساختیات، پس ساختیات، مابعد جدیدیت'' پر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، غالب ایوارڈ (1985)، صدر پاکستان کی جانب سے ستارۂ امتیاز (2012)، اقبال سمّان، کُسم انجلی فونڈیشن ایوارڈ بھی حاصل ہوئے۔ 2002 میں مجلس فروغ اردو ادب، درجہ، قطر کے ایوارڈ سے سرفراز کئے گئے۔ (اس ادارے کے وہ 1996 سے بابِ ہند کے جیوری چیئر مین بھی رہے)۔

پروفیسر نارنگ کی پاکستان میں بھی اسی قدر عزت تھی جتنی ہندوستان میں۔ بقول ناول نگار و افسانہ نویس انتظار حسین کے، ''وہ (نارنگ) جب پاکستان آتے ہیں ہندوستان کو ایک اکائی کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ یہ بات میں کسی اور کے لئے نہیں کہہ سکتا۔ جب وہ اسٹیج پر آتے ہیں ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ پورا ہندوستان مجموعی طور پر ہم سے مخاطب ہے''۔ ہندی افسانہ نگار کملیشور کا یہ قول مشہور ہے کہ ہر زبان کو ایک گوپی چند نارنگ کی ضرورت ہے۔

نارنگ کی مقبولیت اور تعظیم ہر اس ملک میں تھی جہاں وہ جاتے تھے۔ انہوں نے کئی ممالک کا سفر کیا اور ہر جگہ اردو کی خوشبو اور روشنی پھیلائی۔ نہ صرف انہیں دنیا میں اردو کا سفیر سمجھا جاتا تھا بلکہ حقیقتاً وہ اردو کے سفیر ہی معلوم ہوتے تھے۔ (میں اس کا شاہد ہوں کیونکہ اتفاق سے چند ممالک میں ہم دونوں ہمسفر رہے)۔ وہ ساہتیہ اکادمی کے صدر رہ چکے ہیں چند سال قبل انہیں ساہتیہ اکادمی کا فیلوشپ اعزاز بھی دیا گیا جو اکادمی کا سب سے بڑا اعزاز ہے۔ مختلف اعلیٰ اداروں اور یونیورسٹیوں کے باوقار اعزازات سے نوازے گئے تھے۔ جن میں سرسیّد نیشنل ایلیسلینس ایوارڈ بھی شامل ہے۔ اٹلی کا میزینی گولڈ میڈل یا جو اعزاز بھی انہیں ملا ان کے چاہنے والوں کو لگتا تھا کہ وہ اعزاز اردو کو ملا ہے۔

مشہور اردو فکشن رائٹر قرۃ العین حیدر نے ایک بار گوپی چند نارنگ کو اردو کا ''مردِ رینے ساں'' (Renaissance man) قرار دیا تھا)۔ نارنگ اپنی زندگی کو اردو زبان و ادب کی راہ میں سفرِ عشق سے تعبیر کرتے تھے۔ گرچہ ان کی مادری زبان سرائیکی تھی لیکن اپنی تقریروں میں اردو کو وہ تمام زبانوں میں تاج محل کا درجہ اور ملک کی مختلف قومیتوں میں رابطے کا پُل قرار دیتے تھے۔ اردو کی چاہ میں یہ شعر اکثر وہ اپنی تقریروں میں دہراتے تھے:

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

وہ کہتے تھے اردو میری ضرورت ہے، میں اردو کی ضرورت نہیں ہوں۔ ان کی شخصیت اتنی بلند تھی کہ ان سے

قریب ہونے کا ارمان یا ان کے ذریعہ انعام واعزاز پانے کی خواہش کرنے والوں کی کمی کبھی نہیں رہی۔ اور اپنا مطلب پورا ہوجانے کے بعد انہیں چرکہ یا ہزیمیت دینے والوں کی بھی کمی نہ تھی۔ معلوم نہیں ان کا سینہ 56 انچ کا تھا کہ نہیں لیکن وہ نڈر بلوچ تھے اور دشمنوں کو ان کی کرنسی میں جواب دینے کی اہلیت بھی ان میں خوب تھی۔ بدخواہ انہیں مصروف رکھتے تھے اور وہ اپنے بدخواہوں کو۔ بقول یوسف ناظم وہ ''نا۔رنگ'' تھے جس پر کوئی رنگ نہیں چڑھتا۔ طاقتور ارادوں کے آدمی تھے۔ اپنی تقریروں میں یہ بات اکثر کہتے تھے ''خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے حاسد نہیں محسود بنایا ہے''۔ موصوف میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ کسی سے اپنے آزمودہ دوستوں کی بُرائی سننا گوارا نہیں کرتے تھے۔ (میں اس کا گواہ ہوں)۔

گوپی چند نارنگ 45 اردو اور 15 انگریزی و ہندی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی سبھی کتابوں کا ایک نظریا ایک نظریہ سے جائزہ نہیں لیا جاسکتا۔ سب کے موضوع الگ ہیں اور ہر کتاب قاری سے ایک الگ ویژن کا مطالبہ کرتی ہے۔ ان میں املا نامہ جیسی کتاب ہے تو ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں بھی ہے۔ فکشن کے فن سے متعلق ''اردو افسانہ روایت اور مسائل''، ''ادب کا بدلتا منظر نامہ''، ''ادبی تنقید اور اسلوبیات''، ''امیر خسرو کا ہندوی کلام''، ''سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ''، '' تحریکِ آزادی اور ہندوستان کی اردو شاعری''، ''ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت''، ''دلی دکنی، تصوف، انسانیت اور محبت کا شاعر''، ''انیس شناسی''، ''بیسویں صدی میں اردو ادب''، ''اطلاقی تنقید''، ''فراق گورکھپوری''، ''سجاد ظہیر''، ''اقبال کا فن''، ''فکشن شعریات''، ''اردو غزل اور ہندوستانی ذہن وتہذیب'' ان سب کتابوں کا مطالعہ زمانے نے الگ الگ ذہن سے کیا۔

حالیہ کتابوں میں ''غالب، معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات'' مطالعۂ غالبیات کے کئی نئے رخ دکھاتی ہے۔ کسی متن کا تجزیہ کرتے ہوئے وہ اس کے صرف نصابی یا جامعاتی پہلو پر غور کرنے تک خود کو محدود نہیں رکھتے تھے۔ معنی کی تلاش میں وقت کی حرَکی صفات ان کے پیش نظر ہوتی تھیں۔ اس میں شک نہیں کہ اطلاقی تنقید وقت کی نئی کروٹوں کے ساتھ لفظوں کے مفاہیم بدل سکتی ہے۔ اگر اس نظریہ پر گوپی چند نارنگ کاربند نہ ہوتے تو غالب، معنی آفرینی، جدلیاتی وضع شونیتا جیسی کتاب نہیں لکھ سکتے تھے۔ یہ مانا کہ لکھا ہوا لفظ ٹھہری ہوئی شے بن جاتا ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ معنی کے پاؤں میں وقت بیڑی ڈال دے۔ وقت زبان کا تناظر بدل سکتا ہے (اور بدل بھی دیتا ہے) وہ معنی کی کروٹ بدل سکتا ہے۔ نظریہ ساز نقاد اگر اعلیٰ محقق بھی ہو تو تاریخی حقائق پر نئی شعوری نگاہ ڈال کر متن سے نئے مفاہیم برآمد کر لیتا ہے۔ نارنگ اس جدید نظریہ کے حامی تھے کہ لکھاری نہیں لکھتا، متن لکھتا ہے۔ ''ادب کا بدلتا منظر نامہ'' اور ''تحریک آزادی اور ہندوستان کی اردو شاعری'' یا ''ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت'' جیسی کتابیں جو نارنگ نے لکھیں اس کے پیچھے ان کا تاریخی حقائق کا از سر نو جائزہ لینے کا جتن شامل ہے۔ بڑے تنقیدی کام یا کارنامے سکّہ بند ذہنوں کا نتیجہ نہیں ہوتے۔ نارنگ کے مضامین چاہے امیر خسرو پر ہوں، میر وغالب پر ہوں، دلی کی کرخنداری بولی پر ہوں، ساحر لدھیانوی کے بھجنوں پر ہوں، فراق، فیض، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین پر ہوں ادب میں سموئی اور سوئی ہوئی تہذیب و ثقافت کو جگاتے ہیں۔ ان پر کئی رسالوں کے خاص شمارے نکلے اور کتابیں شائع ہوئیں۔ لیکن انشاء کا خاص نمبر سب سے زیادہ اہتمام سے نکلا۔ اور عالمگیر اہمیت کا حامل ہے۔

اندیشہ اب اس کا ہے کہ اس زمانے کے آخری بیدار ذہن اردو نقاد کے دنیا سے کوچ کر جانے کے بعد اردو تنقید خدا نہ کرے کہ لمبی نیند سو جائے۔

اردو زبان وادب کو اس دولتِ بیدار کے بخشندہ گوپی چند نارنگ کے کارناموں اور یادوں کو سلام!۔

☆☆☆

علی گڑھ سے گوپی چند نارنگ کے رشتے

امریکہ کے ڈاکٹر عبداللہ علیگ کی ایک محفل

علی گڑھ نارنگ رشتوں پر علی گڑھ والوں نے خوب خوب لکھا ہے،

علی گڑھ سے نارنگ کے گونا گوں رشتے اس وقت سے قائم تھے جب وہ دہلی یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے پہلی بار علی گڑھ آئے تھے، اور لٹن لائبریری سے استفادہ کرنا چاہتے تھے۔ یہ ۱۹۵۳ء یا ۱۹۵۴ء بات ہے۔ خواجہ احمد فاروقی انھیں بڑا عزیز رکھتے تھے، اپنے نام خواجہ صاحب کے خطوط انھوں نے خدا بخش سے کتابی صورت میں شائع بھی کرا دیئے تھے۔ علی گڑھ سے ان کے سب سے خوبصورت سب سے قیمتی اٹوٹ رشتے اس وقت قائم ہوئے جب انھیں علی گڑھ نے ۱۹۱۳ء کے آس پاس اعزازی ڈگری دی۔

علی گڑھ کے ڈاکٹر عبداللہ نے نارنگ کی یاد میں ایک محفل سجائی تھی، جس میں کسی نے نارنگ کی زبان سے ایک شعر سنایا تھا (کس نے؟ شاید افتخار عارف نے)۔ جو نارنگ کا نہیں تھا، انھوں نے صرف پڑھا تھا۔ وہ شعر یہ تھا:

...... - لذتِ عشق گئی غیر کے مرجانے سے

یہ شعر آپ کو یاد ہو تو پورا کر دیں۔



ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کو علی گڑھ کی ڈاکٹر آف لیٹرس کی اعزازی ڈگری

List of contents of Aligarh Diaspora 1-16

علی گڑھ ڈائسپورہ کے سولہ شماروں کے مشتملات

Urdu Section:

اردو (اصل)